علامہ اقبال کا سفر افغانستان: بعض احوال و کوائف

عبدالرؤف رفیقی ۞

علامہ اقبال کے کلام میں افغانستان اور افغانوں کا ذکر جابجا ملتا ہے۔ انھیں اس قوم سے بہت محبت تھی جس کی وجہ ان کی سخت کوشی اور دین و مذہب سے غیر معمولی تعلق ہے۔ غلام ہندوستان اور عالم اسلام میں مسلمانوں کے ابتلا کے زمانے میں اقبال کو حریت، جرأت اور آزادی کی صورتیں افغانستان میں نظر آئیں، اس لیے اقبال نے افغانوں کی تعریف کی تاکہ ان کی تقلید میں دیگر مسلمانوں میں بھی حریت، جرأت اور آزادی کا جذبہ پیدا ہو۔ افغانوں کی نااتفاقی کا صدمہ بھی اقبال کی تحریروں سے عیاں ہے۔ **ضربِ کلیم** میں 'محراب گل افغان کے افکار' کے عنوان کے تحت انھوں نے خوش حال خان خٹک ہی کے درسِ اتحاد کو دہرایا ہے۔ اقبال نے ہمیشہ افغان حکم رانوں سے بھی امیدیں وابستہ کیں۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح ماضی میں محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور احمد شاہ ابدالی نے برصغیر میں اسلام کو تقویت فراہم کی، موجودہ حکم ران بھی افغانستان کو فلاحی اسلامی مملکت کا رنگ دیں۔ اقبال نے اپنا معروف شعری مجموعہ **پیامِ مشرق** غازی امان اللہ خان کے نام منسوب کیا ہے، نیز اس کے دیباچے میں بھی افغانستان اور افغانوں سے توقعات کے اشارات موجود ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں جب **پیامِ مشرق** شائع ہوئی، افغانستان میں شاہ امان اللہ خان کی حکومت تھی۔ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے چمن کے راستے سے یورپ کا سفر اختیار کیا اور سفر سے واپسی پر ایران، ہرات، قندھار اور غزنی سے ہوتے ہوئے یکم جولائی ۱۹۲۸ء کو کابل پہنچے۔ امیر امان اللہ خان اس سفر میں یورپ کے سحر سے بہت متاثر ہوئے اور افغانستان میں جدید اصلاحات کے نفاذ میں جلد بازی سے کام لیا۔ اس دور میں امیر امان اللہ خان کے خلاف بعض وجوہ سے افغانستان کی فضا بہت خراب ہوگئی، اس لیے وہ اپنے خاندان کے ساتھ ۲۲/ جون ۱۹۲۹ء کو یورپ چلے گئے اور افغانستان ایک غیر معروف شخص امیر حبیب اللہ المعروف بہ بچّہ سقّہ کے ہاتھ میں آگیا۔ نادر شاہ جو اس وقت پیرس میں مقیم تھے، افغانستان کو مزید تباہی سے بچانے کے لیے لاہور کے راستے افغانستان گئے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر نادر شاہ کے استقبال کے لیے اقبال موجود تھے۔ نادر شاہ جب دوبارہ تخت پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے ملک میں وسیع تر اصلاحات کا آغاز کر دیا اور سب سے پہلے ملک کی تعلیمی حالت پر توجہ دی۔ اس نے ہندوستان کی مقتدر شخصیات کو افغانستان کا دورہ کرنے کی دعوت

۞ ڈائریکٹر، رفیقی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کاسی روڈ، کوئٹہ۔ (abdulraufrafiqui@yahoo.com)

دی تاکہ افغانستان میں تعلیمی اصلاحات کا خاکہ تیار کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال اور سر راس مسعود کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔[۱]

یہ سفر اگرچہ باقاعدہ طور پر اکتوبر ۱۹۳۳ء میں کیا گیا، لیکن نادر شاہ غازی سے دیرینہ تعلقات اور افغانستان سے قلبی وروحانی تعلق وعقیدت کی بنیاد پر بہت پہلے سے اقبال اس پروگرام کے بارے میں سوچتے رہے۔ اس شدید خواہش کا اظہار ان کے ایک مکتوب بنام مولوی صالح محمد محررہ ۴/ اگست ۱۹۳۰ء میں ملتا ہے۔ ''۔۔۔۔ کابل جانے کا امکاں ہے، جشنِ استقلال وسطِ اگست میں ہے، لیکن وسطِ اگست میں، میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لیے لکھنو جارہا ہوں، اگر اس موقع پر کابل نہ جاسکا تو کسی اور موقع پر ان شاءاللہ ضرور جاؤں گا۔''[۲]

علامہ کی افغانستان روانگی سے قبل کئی مکتوبات میں اس سفر سے متعلق تذکرہ موجود ہے۔ مشہور ایرانی محقق سعید نفیسی کے نام ایک مکتوب محررہ ۴ نومبر ۱۹۳۲ء میں لکھتے ہیں:

> یہ پڑھ کر کہ پیامِ مشرق اور زبورِ عجم آپ کو پسند آئی ہیں اور ان کی فارسی بھی معیاری ہے مجھے فخر محسوس ہوا ہے۔ جس طرح ایران کے دانشمند نیاز مند کے دیدار کے خواہش مند ہیں، اس طرح مجھے بھی ان سے ملنے اور ایران پہنچنے کی آرزو ہے، لیکن کمزوری اور پریشانی سدِّ راہ ہے۔ تھوڑے عرصے بعد افغانستان کا سفر درپیش ہے۔ آرزو ہے کہ ایران کو بھی دیکھوں اور آپ کا دیدار بھی خدا نصیب کرے۔[۳]

چناں چہ علامہ نے جب محمد نادر شاہ غازی کی جانب سے افغانستان آنے کا باقاعدہ دعوت نامہ وصول کیا تو اس کا ذکر یوں کیا:

از حضور او مرا فرماں رسید — آنکہ جانِ تازہ در خاکم دمید

''سوختم از گرمیِ آوازِ تو — اے خوش آں قومے کہ داند رازِ تو

از غمِ تو ملتِ ما آشنا ست — می شناسیم ایں نواہا از کجا ست

اے باآغوشِ سحابِ ما چو برق — روشن و تابندہ از نورِ تو شرق

۱۔ دیکھیے: عبدالسلام ندوی، **اقبالِ کامل** (لاہور: آتش فشاں پبلیکیشنز، ۱۹۹۲ء)، ۴۰۔

۲۔ محمد عبداللہ قریشی، **روحِ مکاتیبِ اقبال** (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء)، ۴۰۵۔

۳۔ نفسِ مصدر، ۴۵۰۔

یک زمان در کوهسارِ ما درخش   عشق را باز آں تب و تابے بہ بخش
تا کجا در بندہا باشی اسیر   تو کلیمی راہ سینائے بگیر!"
طے نمودم باغ و راغ و دشت و در   چوں صبا بگذشتم از کوہ و کمر[۴]

(ان کی طرف سے مجھے فرمان پہنچا ہے جس نے میری خاک میں نئی روح ڈال دی ہے۔ ہم تیری آواز کی گرمی سے جل گئے۔ زہے نصیب اس قوم کے جس نے تیرے راز کو پایا۔ تیرے غم سے ہماری ملت (یعنی افغان قوم) آشنا ہے، میں جانتا ہوں کہ یہ آواز کہاں سے ہے۔ اے وہ ہستی جو ہمارے بادل کی آغوش میں بجلی کی طرح ہے، تیرے نور سے مشرق روشن ہے۔ کچھ عرصہ ہمارے پہاڑوں پر بھی چمک اور عشق کو پھر سے وہی تب و تاب بخش۔ تو کب تک قید و بند کا اسیر رہے گا؟ تو تو کلیم ہے، کوہ سینا کی راہ تلاش کر۔ میں نے باغ، مرغ زار ور دشت کی مسافتیں طے کر لیں اور بادِ صبا کی مانند میں نے پہاڑوں اور وادیوں کا راستہ قطع کیا۔)

کابل میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یونی ورسٹی کے قیام کی ضرورت

علامہ اقبال، سر سید راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو دعوت

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، افغانستان کے بادشاہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی نے حضرت علامہ سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ، ڈاکٹر سر سید راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور علامہ سید سلیمان ندوی اعظم گڑھ کو کابل کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ ان کے دورے کا مقصد یہ تھا کہ وہ وزیر تعلیم افغانستان کو کابل میں مجوزہ یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مدد دیں اور انھیں اپنے مشوروں سے نوازیں۔ افغانستان میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ چند ثانوی اسکول موجود تھے، جن میں اساتذہ طلبہ کو فرانسیسی، انگریزی، جرمن اور امریکی یونی ورسٹیوں کے لیے تیار کرتے تھے۔ موجودہ حکومتِ افغانستان کابل میں یونی ورسٹی کے قیام پر غور کر رہی تھی، لیکن دشواری یہ تھی کہ اس یونی ورسٹی میں مذہبی تعلیم اور موجودہ سائنس کی تعلیم دینے پر قدامت پسند علما کی جانب سے شدید مخالفت کا سامنا تھا۔[۵]

۴۔ محمد اقبال، **مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق مع مسافر** (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۵ء)، ۵۶۔

۵۔ **انقلاب**، ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۳۳ء؛ محمد اکرام چغتائی، **اقبال افغان اور افغانستان** (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ۷۱-۷۰۔

اس سفر کے ہم رکاب مولانا سید سلیمان ندوی کو علامہ نے سفر سے متعلق کئی مکتوبات لکھے۔ اِن مکتوبات میں اس سفر کی غرض و غایت، انتظامی امور، پاسپورٹ سے متعلق مسائل وغیرہ امور پر گفت گو کی گئی ہے۔ بعض خطوط سر راس مسعود کے نام بھی ہیں۔ اس سفر کا ذکر اس وقت کے بعض اخبارات میں بھی آیا۔[۶] یہاں ان شخصیات کے نام ایک ایک خط درج کیا جاتا ہے۔

مکتوب اقبال بنام سید سلیمان ندوی (ستمبر ۱۹۳۳ء)

۱۰/ ستمبر ۱۹۳۳ء

مخدومی جناب مولانا السلام علیکم!

ایک عریضہ پہلے ارسال کر چکا ہوں اس کے جواب کا انتظار ہے۔ اس عریضے میں یہ دریافت کرنا بھول گیا کہ ملا محب اللہ بہاری کی کتاب جوہر الفرد کہاں سے ملے گی؟

شاہِ افغانستان آپ سے تعلیم مذہبی کے بارے میں مشورہ چاہتے ہیں، شاید اسی ماہ ستمبر میں آپ کو کابل سے دعوت آئے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ جانے کے لیے تیار ہوں گے؟ ممکن ہے کہ سید راس مسعود اور اقبال بھی آپ کے ہمراہ ہوں۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہو گا۔

جواب کا انتظار ہے۔

محمد اقبال لاہور[۷]

مکتوب اقبال بنام سر راس مسعود (ستمبر ۱۹۳۳ء)

افغانی قنصل سے جو دعوت نامہ ابھی ملا ہے، وہ روانہ کر رہا ہوں۔ میں نے ایم سلیمان ندوی کو تاریخ وغیرہ کی بابت لکھا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے لیے کونسی تاریخ مناسب رہے گی، لیکن پاسپورٹ مل جانے کے بعد ہی تاریخ کا تعین کیا جائے گا۔ قنصل کو پاسپورٹ کے بارے میں تحقیقات کے لیے لکھ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پاسپورٹ کے لیے برٹش حکام کو (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) درخواست دینا ہو گی۔ قنصل کا ایک نمائندہ ہمارے ساتھ ہو گا۔[۸]

۱۹/ اکتوبر کو پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی کے نام ایک اور مکتوب میں بھی سفر افغانستان کا تذکرہ ہے:

میں کل کابل جا رہا ہوں اس واسطے فرصت نہیں ہے۔ آپ مہربانی کر کے اس خط کا جواب راقم کو دے دیں۔ ان کو یہ

۶- ان خطوط کے لیے دیکھیے: چغتائی، نفس مصدر، ۷۲- ۷۳۔

۷- چغتائی، نفس مصدر۔

۸- **اقبال ریویو** (کراچی: اقبال اکادمی)، جنوری ۱۹۷۶ء، ۴۱۔

بھی لکھ دیں کہ میں کابل جارہا ہوں۔ اس واسطے خود جواب نہ لکھ سکا۔[۹] چناں چہ ۱۹ر اکتوبر ہی کو علامہ کا سفر افغانستان سے متعلق درج ذیل اخباری بیان شائع ہوا:

تعلیم یافتہ افغانستان ہندوستان کا بہترین دوست ہوگا۔ کابل میں ایک نئی یونی ورسٹی کا قیام اور ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں اسلامیہ کالج پشاور کو ایک دوسری یونی ورسٹی میں تبدیل کرنے کی سکیم ہندوستان اور افغانستان کے درمیانی علاقہ میں بسنے والے ہوشیار افغان قبیلوں کو سدھارنے میں بہت زیادہ ممد ثابت ہوگی۔

شاہِ افغانستان نے ہمیں اس لیے دعوت دی تھی کہ ہم وہاں وزیرِ تعلیم کو کابل میں یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مشورہ دیں۔ اعلیٰ حضرت کی دعوت کو قبول کرنا ہم نے اپنا فرض سمجھا۔ کابل سے شائع ہونے والے مختلف جرائد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کا نوجوان طبقہ نئے علوم کی تحصیل اور انھیں اپنے مذہب اور تمدن کے سانچے میں ڈھالنے کا بے حد خواہش مند ہے۔ افغان لوگ بہت خلیق ہوتے ہیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کی زیادہ سے زیادہ امداد کریں۔ اب یہ امر بالکل واضح ہے کہ افغان لوگوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ہمیں اُمید واثق ہے کہ ہندوستان کے اندر تعلیمی تجربہ کی روشنی میں ہم انھیں تعلیمی مسائل میں مفید مشورہ دے سکیں گے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ خالص دنیوی تعلیم سے اچھے نتائج پیدا نہیں ہوئے اور خصوصاً اسلامی ممالک میں مزید برآں کسی طریقہ تعلیم کو قطعی اور آخری نہیں کہا جاسکتا ہر ملک کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اور کسی ملک کو تعلیمی مسائل کے متعلق فیصلہ کرنے میں اس ملک کی خصوصی ضروریات کو خاص طور پر مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔[۱۰]

علامہ کے اس بیان کو روزنامہ **انقلاب** نے یوں درج کیا ہے:

لاہور۔ ۱۸ر اکتوبر۔ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کابل روانہ ہونے سے قبل اپنے دورے کے بارے میں مندجہ ذیل بیان دیا ہے۔" آپ نے فرمایا "میری رائے میں یہی مناسب ہے کہ عازمِ افغانستان ہوتے وقت ایک نہایت ہی مختصر بیان دیا جائے اور اپنے اہلِ ملک کو افغانستان کی ہمسایہ حکومت کے متعلق بالکل مجمل طور پر کچھ بتا دیا جائے۔ اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی نے ہمیں تعلیمی معاملات میں وزیر تعلیم کی رہنمائی اور کابل میں مجوزہ یونی ورسٹی کے قیام کے متعلق دعوت دی ہے۔ ہم اس دعوت کی قبولیت کو اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ کابل کی متعدد مطبوعات اور خاص کر ماہوار رسالہ **کابل** کے مضامین سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ افغانستان کا نوجوان طبقہ علوم حاضرہ کے حصول اور ان کی اپنے مذہب و کلچر کے ساتھ مطابقت کے لیے بے حد آرزو مند ہے۔ افغان ایک دل چسپ قوم ہے اور ایک ہندوستانی کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم بقدر استطاعت ان کی ہر ممکن امداد کریں۔

اس قوم میں ایک جدید احساس کے ارتقا و احیا کی علامات بالکل نمایاں طور پر نظر آرہی ہیں اور ہم توقع کرتے ہیں کہ ہم اپنے ہندوستانی تجربات کی روشنی میں ان کی رہ نمائی کر سکیں گے۔ ذاتی طور پر میری یہ رائے ہے کہ تعلیم کو مکمل طور پر دنیوی بنا دینے

۹۔ **روحِ مکاتیبِ اقبال**، ۴۷۸۔

۱۰۔ لطیف احمد خان شیروانی، مرتب، **حرفِ اقبال** (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، سن ندارد) ۲۰۲۔

سے کسی جگہ بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا اور اسلامی ممالک کی تو بالخصوص یہی کیفیت ہے کہ وہاں تعلیم کا کوئی خاص سسٹم بھی موجود نہیں۔ ہر ملک کی ضروریات جداگانہ ہیں، لہٰذا ان کے تعلیمی مسائل پر بھی ان ضروریات کی روشنی میں بحث کی جانی چاہیے۔ کابل میں ایک جدید یونی ورسٹی کے قیام اور اسلامیہ کالج پشاور کو ایک یونی ورسٹی بنا دینے سے افغانستان اور ہندوستان کی سرحدوں کے درمیان ذکی اور ذہین افغان آبادی کو بے انتہا فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔

انقلاب، ۲۰/ اکتوبر ۱۹۳۳ء[11]

یہاں یہ توضیح ضروری ہے جس کو محمد اکرام چغتائی نے قلم زد کیا ہے۔ یہ بیان *Speeches writings and statements of Iqbal* میں موجود ہے۔[12] اس کے انگریزی متن اور اردو ترجمے میں اختلاف ہے۔ یہاں کی ترتیب بھی مختلف ہے۔ **انقلاب** میں مکمل بیان ترجمہ ہو کر شائع ہوا جب کہ انگریزی اخبارات میں کچھ تبدیلی کے ساتھ شائع ہوا تھا۔[13]

اقبال کی روانگی کابل

علامہ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور آپ کے ساتھ پروفیسر ہادی حسن[14] اور سر راس مسعود کے ساتھ بیرسٹر غلام رسول خاں[15] بطورِ سیکرٹری ہم راہ تھے۔ علامہ اقبال اور سر راس مسعود لاہور سے ۲۰/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو پشاور روانہ ہوئے۔

سید سلیمان ندوی پاسپورٹ تاخیر سے ملنے کے باعث ۲۳/ اکتوبر کو عازم سفر ہوئے۔[16] اسی شام سر صاحب زادہ عبدالقیوم خاں نے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور ڈاکٹر راس مسعود کو پشاور میں چائے کی دعوت دی۔ اس کا ذکر **انقلاب** اخبار کے علاوہ کہیں بھی نہیں ہے۔[17] ڈین ہوٹل پشاور میں رات بسر کرنے کے بعد ۲۱/ اکتوبر کی صبح

۱۱۔ چغتائی، مرجع سابق، ۷۱۔

12- Edt. L.A. Sherwani, *Speeches writings and statements of Iqbal* (Lahore: Iqbal Academy, 1995), 238.

۱۳۔ چغتائی، مرجع سابق، ۷۷۔

۱۴۔ آپ نواب محسن الملک کے بھتیجے تھے، اور لندن یونی ورسٹی سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کی تھی۔ اس زمانے میں آپ علی گڑھ یونی ورسٹی کے شعبہ فارسی سے وابستہ تھے۔

۱۵۔ ۱۹۰۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں کے دور میں چند سال افغانستان کے شعبۂ تعلیمات میں رہ چکے تھے۔

۱۶۔ **انقلاب**، ۲۲/ اکتوبر ۱۹۳۳ء۔

۱۷۔ نفس مصدر، ۲۴/ اکتوبر ۱۹۳۳ء۔

حکومت افغانستان کی طرف سے فراہم کردہ خصوصی موٹر کار میں پشاور سے کابل کے لیے روانہ ہوئے۔ پشاور سے نکل کر درۂ خیبر سے گزرے۔ اس سفر میں اقبال خوب صورت اور جمالیاتی احساسات سے سرشار تھے، جنھیں انھوں نے مثنوی مسافر میں بیان کیا ہے؛ مولوی شمس تبریز خان ان تاثرات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> وہ جب درۂ خیبر سے گزرتے ہیں تو یہاں سے گزرنے والے مردانِ حق اور تاریخ کے صدہزار افسانے یاد آجاتے ہیں۔ وہ بے سبزہ کوہساروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ ان کے سینوں سے رنگ و بو کی نزاکت نہیں اگتی، جہاں کا مور بھی شاہی مزاج اور آہو شیر اں شکار ہوتا ہے، لیکن لامرکزیت نے ان بہادروں کو آشفتہ روزگار اور بے نظام و ناتمام و نیم سوز بنادیا ہے اور ان کے پتھروں سے خود ان کے مینائے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہے۔[۱۸]

رات جلال آباد میں بسر کی اگلے روز ۲۲/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جلال آباد سے روانہ ہو کر شام کو کابل پہنچے۔ ابھی کابل آٹھ میل دور تھا کہ حکومتِ افغانستان کے ایک وزیر احمد شاہ خان نے وفد کی پذیرائی کی اور انھیں شاہی مہمان کی حیثیت سے دارالامان میں رکھا گیا۔[۱۹]

شہر کابل خطہ جنت نظیر — آبِ حیواں از رگِ تاکش بگیر!

چشمِ صاحب از سوادش سرمہ چین — روشن و پائندہ باد آں سرزمین

در ظلامِ شب سمن زارش نگر — بربساطِ سبزہ می غلطد سحر!

آں دیارِ خوش سواد آں پاک بوم — بادِ او خوشتر زبادِ شام و روم

آبِ او براق و خاکش تابناک — زندہ از موج نسیمش مردہ خاک

ناید اندر حرف و صوت اسرارِ او — آفتاباں خفت در کہسارِ او

ساکنانش سیرِ چشم و خوش گہر — مثلِ تیغ از جوہرِ خود بے خبر!

۱۸۔ ابوالحسن علی ندوی، **نقوشِ اقبال**، اردو ترجمہ شمس تبریز خان، اضافہ عنوان از مترجم: "مسافر" کی واردات و مشاہدات (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س۔ن)، ۲۰۷۔

۱۹۔ عبدالسلام خورشید، **سرگذشت اقبال** (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۹۶ء)، ۳۴۸۔

قصرِ سلطانی کہ نامش دلکشا ست　　زائران را گردِ راہش کیمیا ست[۲۰]

(کابل شہر جنت جیسا خطہ ہے، اس کے انگور سے آبِ حیات حاصل کرو۔ صائب تبریزی کی آنکھ بینا ہی سے سرمہ پاتی ہے اور یہ سرزمین روشن و پائندہ ہے۔ رات کی تاریکی میں اس کی چنبیلی کا باغ دیکھو، سبزے کی بساط پر سحر کے جلوے لوٹتے ہیں۔ وہ ایک خوش ماحول خطہ اور صاف ستھری سرزمین ہے، اس کی ہوا شام وروم سے زیادہ اچھی ہے۔ اس کا پانی صاف اور مٹی روشن ہے۔ اس کی بادِ نسیم سے مردہ خاک زندہ ہے۔ اس کے اسرار حرف و آواز میں نہیں آسکتے، اس کے پہاڑوں میں کئی آفتاب چھپے ہیں۔ اس کے باشندے سیر چشم اور شریف ہیں لیکن تلوار کی طرح اپنے جوہر سے بے خبر ہیں۔ شاہی محل جس کا نام دل کش ہے، اس کے راستے کی مٹی زائرین کے لیے کیمیا ہے۔)

علامہ کی کابل آمد اور وہاں ان کے پرجوش استقبال کی خبریں ہندوستانی اخبارات روزنامہ **انقلاب** وغیرہ کی زینت بنیں۔[۲۱]

۲۴ر اکتوبر تا ۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کابل میں علامہ اور ان کے ہم سفروں کے ساتھ تعلیمی مشاورت کے لیے چند اجلاس ہوئے جن میں حکومتِ افغانستان کے بعض سرکردہ افراد نے شرکت کی۔ ان اجلاسوں میں کارروائی سر راس مسعود نے نوٹ کی۔ ان میں سے ایک اجلاس کی خبر روزنامہ **انقلاب** لاہور نے شائع کی:

کابل ۲۴ر اکتوبر، **سول اینڈ ملٹری گزٹ** کے نامہ نگار کی وساطت سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ، سر راس مسعود، سردار فیض محمد خان اور افغانستان کے بورڈ آف ایجوکیشن کے دیگر ارکان کے درمیان پانچ گھنٹے تک افغانستان میں تعلیم کے موضوع سے متعلق کانفرنس ہوتی رہی۔ کل پھر اجلاس ہوگا، جس میں یونی ورسٹی کی تعلیم کے متعلق بحث ہوگی۔ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور سید راس مسعود مقامی اداروں کا معائنہ بھی فرمائیں گے۔ کل وزیر اعظم افغانستان کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ اعلیٰ حضرت نادر شاہ پنج شنبہ کو مہمانوں سے ملیں گے۔[۲۲]

نیز علامہ اور راس مسعود کی ملاقات ۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو نادر شاہ سے بھی ہوئی۔ اس ملاقات میں علامہ کے مطابق عصر کی نماز انھوں نے نادر شاہ کی اقتدا میں پڑھی، کہتے ہیں:

۲۰۔ اقبال، مسافر، ۶۱۔

۲۱۔ چغتائی، **انقلاب**، ۳ر نومبر ۱۹۳۳ء۔

۲۲۔ نفس مصدر، ۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۰ء۔

وقتِ عصر آمد صدائے الصلوٰت
آں کہ مومن را کند پاک از جہات
انتہائے عاشقان سوز و گداز
کردم اندر اقتدائے او نماز[۲۳]

(عصر کے وقت الصلوٰۃ کی وہ آواز آئی جو مومن کو ہر طرف سے بے گانہ کر دیتی ہے۔ عاشقوں کی انتہا سوز و گداز ہے۔ میں نے نادر شاہ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔)

جب کہ ڈاکٹر ظہور الدین اسے مغرب کا وقت قرار دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

پہلی ملاقات میں مغرب کی نماز کے موقع پر نادر شاہ نے اقبال سے امامت کی درخواست کی۔ اقبال نے کہا نادر! میں نے اپنی عمر کسی شاہِ عادل کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گزار دی ہے۔ اب جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کو پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیے ہیں تو کیا تو مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے! آج میں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں گا۔ امامت تجھ کو کرنی ہوگی۔[۲۴]

جناب اکرام اللہ شاہد نے علامہ کے سفر افغانستان سے متعلق کچھ نئی تحقیقات کیں جن میں **روزنامہ مشرق** پشاور یکم فروری ۱۹۷۷ء کے حوالے سے افغانستان کے ایک صحافی مقبول احمد کے ایک مضمون کا حوالہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

راقم الحروف اس وقت کابل میں تھا اور اسے حضرت علامہ کے اس دورے میں کئی دفعہ شرفِ ملاقات بھی حاصل ہوا۔ علامہ اقبال نے کابل پہنچنے کے بعد ملتِ افغانیہ کے نام ایک پیغام روزنامہ **اصلاح** میں شائع کرایا تھا جو ایک قطعہ تک محدود تھا، لیکن وہ ادبی لحاظ سے بہت سی صفات کا مجموعہ تھا۔ کابل کے شعرا اور ادبا اس سے بڑے متاثر ہوئے تھے۔ میں اس وقت **اصلاح** ہی میں کام کرتا تھا۔ میں نے اپنے حافظے پر دباؤ ڈالا مگر افسوس یہ قطعہ میری یاد سے محو ہو چکا ہے اور میں اسے پیش کرنے سے قاصر ہوں۔[۲۵]

علامہ کے دورانِ سفر افغانوں کے ساتھ گفت گو کی زبان کا مسئلہ بھی جناب مقبول احمد نے حل کیا ہے۔

۲۳۔ اقبال، مسافر، ۶۳۔

۲۴۔ **اقبال ریویو**، جنوری ۱۹۷۶ء، ۳۹ - ۴۰۔

۲۵۔ اکرام اللہ شاہد، **اقبال اور افغانستان** (مردان: ادارہ اشاعت مدرار العلوم، ۲۰۰۲ء)، ۵۱۔

علامہ فارسی روانی سے نہیں بول سکتے تھے اور پشتو بھی نہیں جانتے تھے، جب کہ افغانوں کے عمومی طبقے میں انگریزی تک رسائی بہت محدود تھی؛ جناب مقبول احمد تحریر کرتے ہیں:

کابل میں بہت سے وفدوں نے حضرت علامہ سے ملاقات کی تھی جن میں اساتذہ، تجار، علما، شعرا، ادبا اور صحافیوں کے وفود شامل تھے۔ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے وفد میں انجمن ادبی کے ارکان مجلہ **کابل** (انجمن ادبی کا ماہوار رسالہ) کے رکن، روزنامہ **اصلاح** ہفتہ وار **انیس** پانزدہ روزہ **اقتصاد**، جمعیت العلماء کے ہفتہ وار اخبار **حی علی الفلاح** کے ایڈیٹر اور کارکن صحافی شامل تھے۔ یہ وفد کوئی پینتیس چالیس ارکان پر مشتمل تھا۔ وفد کے ارکان فارسی میں اظہار خیال کرتے تھے اور علامہ اقبال سر راس مسعود اور غلام رسول بیرسٹر انگریزی میں جواب دے رہے تھے۔ ترجمانی کے فرائض راقم الحروف ادا کر رہا تھا۔ تبادلۂ خیال کے دوران سرور خان گویا، سرور جویا اور مستغنی نے علامہ اقبال کو مخاطب کر کے کہا "آپ فارسی نثر ہی میں نہیں، بلکہ فارسی نظم میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ہم آپ کی خداداد ذہانت اور قابلیت کے معترف ہیں۔ طویل عرصے سے ہماری دلی خواہش تھی کہ آپ سے ہم کلام ہونے کی سعادت حاصل کریں۔ اگر بے ادبی پر محمول نہ ہو تو ہمیں یہ سوال کرنے کی اجازت دیں کہ آپ اتنی علمی و ادبی استطاعت رکھنے کے باوجود فارسی میں ہمارے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے اور انگریزی بولنے کا تکلف کیوں روا رکھتے ہیں؟ حضرت علامہ نے قہقہہ لگایا اور کہا میں فارسی لکھ سکتا ہوں مگر روانی کے ساتھ بول نہیں سکتا، لہٰذا میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں انگریزی میں جواب دیتا رہوں۔ اس جگہ یہ ذکر کرنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ راقم الحروف علامہ اقبال کی انگریزی ہی کا ترجمہ کر رہا تھا۔ وفد کے ارکان فارسی میں جو کچھ کہہ رہے تھے علامہ اقبال اسے بخوبی سمجھ رہے تھے۔[۲۶]

ملاقات میں علامہ نے جنرل نادر خان کو خود قرآنِ کریم کا ایک نسخہ پیش کیا:

در حضور آں مسلمان کریم
ھدیہ آوردم ز قرآن کریم
گفتم این سرمایہء اہلِ حق است
در ضمیر او حیات مطلق است

۲۶- نفس مرجع، ۵۱ - ۵۲۔

اندر و هر ابتدا را انتہا است

حیدر از نیروے او خیبر کشا است[۲۷]

(اس کریم النفس مسلمان کی خدمت میں، میں نے قرآن عظیم کا تحفہ پیش کیا۔ میں نے کہا کہ یہ اہل حق کا سرمایہ ہے، اس کے اندر حیات مطلق ہے۔ اس کے اندر ہر ابتدا کی انتہا ہے۔ حیدر کرار رضی اللہ عنہ اس کی قوت سے خیبر کے فاتح ہوئے۔)

اس نسخے کی عطائی پر جنرل نادر خان نے علامہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جو کچھ کہا، اسے علامہ نے یوں بیان کیا ہے:

کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر

از غمانِ بے حسابم بے خبر

نالہ بابانگِ ہزار آمیختم

اشک با جوے بہار آمیختم

غیر قرآن گلسارِ من نہ بود

قوتش ہر باب را برمن کشود[۲۸]

(پہاڑ اور جنگل میرے اضطراب سے بے خبر ہیں۔ میرے بے حساب غموں سے وہ نا آشنا ہیں۔ میں نے بلبل کے نالوں کے ساتھ اپنی فریاد کو ملایا، بہار کی ندی کے ساتھ میں نے آنسو ملائے ہیں۔ قرآن کے علاوہ میرا کوئی غم خوار نہیں تھا، اس کی قوت نے ہر دراوزہ مجھ پر کھول دیا ہے۔)

اس موقع پر علامہ اقبال اور نادر شاہ کے درمیان جو گفت گو ہوئی، اسے صاحبِ **مکالماتِ اقبال** نے یوں محفوظ کیا ہے:

۲۷۔ اقبال، مثنوی مسافر، ۶۲۔

۲۸۔ نفس مصدر، ۶۳۔

علامہ: اہلِ حق کی یہی دولت و ثروت ہے، اس کی بدولت باطن میں حیات مطلق کے چشمے بہتے ہیں، یہ ہر ابتدا کی انتہا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے۔ اسی کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے، میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز و گداز سب اسی کا فیضان ہے۔

نادر شاہ: جب میں جلاوطن تھا اور کوہ و صحرا میں غم زدہ وقت کاٹ رہا تھا، جب میرے پاس زندگی کے وسائل کی کمی تھی اور مادی طاقت کا فقدان تھا جب کوئی ساتھی اور غم خوار نہ تھا تو یہی کتاب میری رفیق اور رہ نما اور ہمدرد و غمگسار تھی۔[۲۹]

اعلیٰ حضرت نادر شاہ سے اقبال کئی مرتبہ ملے تھے۔ اغلب ہے کہ اقبال نے قرآن کریم کا نسخہ پہلی ملاقات میں پیش کیا ہو گا جو ۲۶/ اکتوبر کو قعر دلکشا میں ہوئی تھی۔[۳۰]

حضرت علامہ کا سفر افغانستان کے دوران شاہ افغانستان کو قرآن کریم کا ہدیہ دینے پر روزنامہ **انقلاب** نے ایک اہم اداریہ "شاہ افغانستان کی بارگاہ میں قرآن حکیم کا ہدیہ۔ اقوام شرق و غرب کی تقدیروں کا آئینہ" کے عنوان سے لکھا۔ جس میں افغانستان میں علامہ کی پذیرائی اور اس دورے کے مضمرات پر بحث کی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے وہاں جو پیغام دیا وہ روزنامہ **اصلاح** کے صفحات کی زینت بنا اور اس کے حوالے سے روزنامہ **انقلاب** نے بھی اپنے اداریے میں نقل کیا، اس میں اقبال نے کہا:

"الحمد اللہ کہ میں نے یہ اسلامی سرزمین دیکھی اور بادشاہ غازی کی بارگاہ میں حاضری سے بھی مشرف ہوا، جس کے ہر کام کی بنیاد و اساس "بندگی خدا" اور "عشق وطن" ہے' یعنی وہ بادشاہ جو شاہی قبا کے نیچے خرقۂ درویشی پہنے ہوئے ہے اور خدائے بزرگ و برتر نے حضرت رسالت مآب ﷺ کی روحانیت کے طفیل اس کی درویشی کو شرف قبولیت بخشا۔"[۳۱]

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، سید سلیمان ندوی کو پاسپورٹ دیر سے ملا۔ چناں چہ وہ ۲۴/ اکتوبر کو پشاور، ۲۵/ اکتوبر کو جلال آباد اور ۲۶/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل پہنچے۔ ندوی صاحب کو پروٹوکول آفیسر جناب سرور خان گویا نے خوش آمدید کہا اور انھیں حلقۂ یاراں میں شامل کیا۔ اس رات مہمانوں کے اعزاز میں صدر اعظم سردار محمد ہاشم خان نے ضیافت کا اہتمام کیا؛ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

اس رات نو بجے شب کو سردار ہاشم خان صدرِ اعظم کے ہاں مہمانوں کی دعوت تھی ان کا ٹیلیفون آیا کہ "نووارد مہمان" بھی شریکِ دعوت ہوں اور لوگ تیار ہو چکے تھے اس لیے تاخیر کے خیال سے میں بھی اسی حالت میں بلا تبدیل لباس ساتھ ہو گیا۔ ہم لوگ دو موٹروں میں روانہ ہوئے۔ ایک میں ڈاکٹر اقبال، میں اور سرور خان گویا اور دوسرے میں سر راس مسعود، پروفیسر ہادی اور غلام رسول خان۔ تھوڑی دیر میں صدرِ اعظم صاحب کے محل تک پہنچے۔ محل میں ہر جگہ

۲۹- سعید راشد، **مکالمات اقبال** (جہلم: بک شوروم کارنر، ۲۰۱۳ء)، ۱۶۵۔

۳۰- چغتائی، **اقبال افغان اور افغانستان**، ۷۸۔

۳۱- **انقلاب**، نومبر ۱۹۳۳ء۔

بجلی کی روشنی تھی۔ جگہ جگہ سپاہیوں کے پہرے تھے۔ ایک دروازہ پر پہنچ کر اُترے۔ دوسرے مہمان سب پہنچ چکے تھے۔ سب سے آخر میں ہم لوگ پہنچے تھے۔ محل میں ہر چیز یورپین طریق و قاعدہ سے تھی۔ ایک گیلری سے ہو کر اندر وسیع دالان میں پہنچے۔ سب سے تعارف و ملاقات ہوئی۔[۳۲]

سردار ہاشم سے مہمانوں کا تعارف سردار فیض محمد خان وزیرِ خارجہ نے کرایا۔ اس کے بعد سردار ہاشم خان مہمانوں کو لے کر کھانے کے کمرے میں گئے۔ کھانا میزوں پر تھا اور ہر چیز پوری طریقے کے مطابق آراستہ تھی۔ کھانا کھلانے کا طریقہ اور ملازمین کا سلیقہ ہر چیز یورپ کے تمدن جدید کے مطابق تھی۔[۳۳] سردار فیض محمد خان وزیرِ خارجہ افغانستان کے بارے میں پتہ چلا کہ انھوں نے علامہ کے اردو کلام کے بعض حصوں کا منظوم فارسی ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس بات کا انکشاف پروفیسر خاطر غزنوی نے کیا جن کے ساتھ میں نے ۲۹/اپریل ۲۰۰۳ء کو صبح ساڑھے گیارہ بجے پشاور یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر صابر کلوروی کے دفتر میں انٹرویو کیا تھا۔ یہ نمونے خاطر غزنوی کے پاس محفوظ ہیں۔[۳۴]

کھانے کے میز پر تبادلۂ خیال شروع ہوا۔ سید سلیمان ندویؒ نے افغانستان میں اشاعت اسلام کے بارے میں گفت گو کی۔ راس مسعود نے اپنے سفر جاپان کے پُرلطف تاثرات و واقعات بیان کیے اور علامہ نے فلسفہ و سیاست کے بعض نکات آسان اور دوستانہ انداز میں واضح کیے۔[۳۵] باقی خاص ایام کے احوال کا ذکر یہاں مرحلہ وار کیا جاتا ہے جس سے اس سفر کی سرگرمیوں پر روشنی پڑ سکے گی۔

جمعہ ۲۷/اکتوبر ۱۹۳۳ء

بادشاہ شہر کی مختلف مسجدوں میں باری باری جمعہ کی نماز ادا کرتے تھے۔ ۲۷/اکتوبر بروز جمعہ کو وہ شہر کی سب سے بڑی مسجد ''پل خشتی'' میں نماز پڑھنے والے تھے۔ علامہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز ادا کرنے مسجد پل خشتی گئے۔ مسجد میں بادشاہ کے لیے مقصورہ بنا ہوا تھا۔ مہمانوں کو بھی مقصورہ میں جگہ دی گئی۔ نمازِ جمعہ سے واپسی پر علامہ اور سید صاحب کے ساتھ ایک ذمے دار شخص بھی تھے۔ ان سے چینی ترکستان کے واقعات کی نسبت گفت گو ہوتی رہی۔ علامہ نے دوران گفت گو میں فرمایا:

۳۲۔ سید سلیمان ندوی، **سیر افغانستان** (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، سن ندارد)، ۷۔

۳۳۔ **اقبال ریویو**، جنوری ۱۹۷۶ء (کراچی)، ۴۱۔

۳۴۔ راقم کا انٹرویو خاطر غزنوی کے ساتھ، ۲۹/اپریل ۲۰۰۳ء بمقام شعبہ اردو یونی ورسٹی آف پشاور۔

۳۵۔ **اقبال ریویو**، جنوری ۱۹۷۶ء (کراچی)، ۴۱۔

یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں سارا زور بحری طاقت پر صرف کیا اور ہر قسم کی تجارتی آمد و رفت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے انھی جہازوں کے ذریعے سے مشرق کو مغرب سے ملا دیا، لیکن اب یہ نظر آرہا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ حیثیت جلد فنا ہو جائے گی، آئندہ مشرق وسطیٰ کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا اور تری کے بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا۔ تجارتی قافلے اب موٹروں، لاریوں، ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعے مشرق و مغرب میں آئیں جائیں گے اور چوں کہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گزرے گا، اس لیے اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہو گا۔ (۳۶)

سید سلیمان ندویؒ علامہ کے اس نظریے کو بالکل درست تسلیم کرتے ہوئے ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں:

پشاور سے کابل کو، چمن سے قندھار کو، کابل سے مزار شریف اور ہرات کو، قندھار سے ہرات کو موٹریں اور لاریاں چل رہی ہیں۔ اُدھر راستہ یا بخارا ہو کر یا ایران ہو کر طے کیجیے۔ پہلے مشرق وسطیٰ کے لوگ خشکی کی راہ سے حج کو جاتے تھے، اکبر کے زمانہ سے ہندوستان کی بندرگاہوں سے جانے لگے اور انگریزوں کے عہد میں افغانستان اور ترکستان بلکہ اکثر مشرقی ملکوں کے مسلمان ہندوستان ہو کر بحری راستہ سے مکہ معظمہ جانے لگے۔ اگر خشکی کا راستہ ذرا درست ہو جائے۔ تو یقین کیجیے کہ ان حاجیوں کو پھر بدستور سابق خشکی کا راستہ پسند آنے لگے گا اور پھر افغانستان یا بلوچستان ہو کر ایران، ایران سے عراق، عراق سے نجد اور نجد سے حجاز کا راستہ کھل جائے گا۔ یہی وہ راستہ تھا جو خلفا اور شاہانِ اسلام کے زمانے میں مستعمل تھا۔ (۳۷)

اس دن چین ترکستان کے وفد سے ملاقات کے بعد علامہ اور ان کے ساتھیوں نے ''دارالامان'' میں سردار فیض محمد خان، اللہ نواز خان اور سرور خان گویاؔ کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس روز شام کو علامہ نورالمشائخ سے ملاقات کرنے کے لیے سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ علامہ ان سے پہلے لاہور میں بھی مل چکے تھے۔ برصغیر کے حالات اور افغانستان میں بچہ سقہ حبیب اللہ کلکانی کے دورِ حکومت پر بحث ہوتی رہی۔

اس روز شام کو افغانستان میں مقیم برصغیر کے باشندوں نے اپنے ہم وطن دانشوروں کے اکرام میں کھانے کا انتظام کیا۔ اللہ نواز خان کے ہاں دعوت کا اہتمام تھا۔ مدعوین میں سردار فیض محمد خان وزیر خارجہ، مولانا سیف الرحمان، مولانا محمد میاں منصور انصاری (مؤلف **علمائے ہند کا شاندار ماضی** و سیکرٹری جمعیت علماے ہند) اور مولانا محمد شبیر (صدر جماعت مجاہدین جن کا مرکز سمرقند تھا) نمایاں تھے۔ (۳۸)

سردار محمد ہاشم خان صدرِ اعظم افغانستان ملاقات کے لیے اُن کی قیام گاہ آئے اور دیر تک گفت گو ہوتی

۳۶۔ نفسِ مرجع، ۴۱ - ۴۲۔

۳۷۔ سلیمان ندوی، مصدرِ سابق، ۹۔

۳۸۔ **اقبال ریویو**، جنوری ۱۹۷۶ء، ۴۱ - ۴۳۔

رہی۔ راس مسعود نے ملک میں معدنیات کی ترقی اور سڑکوں کی تعمیر پر زور دیا، جب کہ سردار صاحب نے ترقیاتی پروگراموں پر روشنی ڈالی۔ مہمانوں کے ساتھ کھانا کھا کر تین بجے رخصت ہوئے۔ چار بجے شام وزیر جنگ شاہ محمود خان کے ہاں چائے کی دعوت تھی جس میں چیدہ افراد نے شرکت کی۔ سات بجے تک اسی دعوت میں وقت گزرا اور افغانستان کے حالات پر گفت گو ہوتی رہی۔ ساڑھے سات بجے شب انجمن ادبی کابل کی طرف سے دعوتِ شب (ڈنر) طے شدہ تھی۔ کابل ہوٹل میں انجمن سے منسلک ادیب جمع ہوئے۔[۳۹]

اتوار ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۳ء

سردار احمد خان وزیر دربار کی دعوت پر شام تین بجے پغمان جانے کا پروگرام تھا۔ علامہ کو نادر شاہ سے آخری ملاقات بھی کرنا تھی، اس لیے پغمان جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ وہ شام کو وزیرِ خارجہ سردار فیض محمد خان کے ساتھ شاہ سے ملنے اُن کی رہائش گاہ ''دلکشا'' گئے۔ رات مختلف حضرات ملاقات کی غرض سے آئے۔ مولوی محمد بشیر صاحب صدر جمعیت مجاہدین، مولانا محمد میاں، منشی میر شمس الدین (سابق ناظم انجمن حمایت اسلام لاہور) ان میں ممتاز تھے۔[۴۰]

کابل کے مختلف مقامات کی سیر کے لیے لے جایا گیا۔ جن میں مکتب صنائع نفیسہ، سرکاری موٹر خانہ، ہوائی اڈہ، بالا حصار کا مکتب حربی، صحابہ کے مزارات، دارالعلوم عربی، جدید مدارس اور سرکاری مطبع عمومی وغیرہ شامل ہیں۔[۴۱] آج کے پروگرام میں ایک خاص پروگرام مزارِ بابر پر حاضری تھی۔ بابر (۱۴۸۲ء- ۱۵۳۰ء) مغل بادشاہوں میں اس لحاظ سے ایک منفرد شخصیت کا ملک تھا کہ رزم و بزم دونوں میں گہری دل چسپی لیتا تھا۔ رزم میں خاراشگافی سے کام لیتا تھا اور جب بزم میں آتا تھا تو زندگی کی ایک ایک رگ کو خوشیوں سے بھر دیتا تھا۔ اقبال نے یہاں موقع کی مناسبت سے ایک غزل کہی جو بلند آہنگ اور جوش سے پُر ہے۔ ردیف اور قافیہ قاری کے دل میں جذبات کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔

یا کہ سازِ فرنگ از نوا بر افتاد است درونِ پردۂ او نغمہ نیست، فریاد است

۳۹۔ نفس مرجع، ۴۳ - ۴۴۔

۴۰۔ نفس مرجع، ۴۷- ۴۸۔

۴۱۔ ندوی، **سیر افغانستان**، ۱۹ - ۲۵۔

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آر است　　من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است

درفشِ ملت عثمانیاں دوبارہ بلند　　چہ گوئمت کہ بہ تیموریاں چہ افتاد است!

خوشا نصیب کہ خاکِ تو آرامید اینجا　　کہ این زمین زطلسمِ فرنگ آزاد است!

ہزار مرتبہ کابلؔ نکوتر از دلیؔ است　　کہ آں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

درونِ دیدہ نگہ دارم اشکِ خونین را　　کہ من فقیرم واین دولت خداداد است!

اگرچہ پیرِ حرم وردِ لاَ اِلٰہ دارد　　کجا نگاہ کہ برّندہ تر ز پولاد است[۴۲]

(آ کہ فرنگ کا ساز نغمے کے بغیر پڑا ہے۔ اس کے پردے کے اندر نغمہ نہیں بلکہ فریاد ہے۔ زمانے نے پرانے بتوں کو ہزار بار سجا کر پیش کیا ہے، میں نے حرم کو ترک نہیں کیا کہ اس کی بنیاد پختہ ہے۔ عثمانیوں کا علم دوبارہ بلند ہوا، تجھے کیا بتاؤں کہ تیموریوں پر کیا مصیبت آن پڑی ہے۔ زہے نصیب کہ تیری خاک اس جگہ آرام کر رہی ہے کہ یہ زمین فرنگیوں کے طلسم سے آزاد ہے۔ کابل دلی سے ہزار درجے بہتر ہے، کہ وہ بڑھیا ہزاروں کی دلہن بنی ہے۔ میں آنکھوں میں خون کے آنسو رکھتا ہوں کہ میں فقیر ہوں اور یہ دولت مجھے حاصل ہے۔ اگرچہ پیر حرم لا الہ کا ورد کرتا ہے لیکن وہ نظر کہاں جو تلوار سے زیادہ تیز ہو۔)

سرور خان گویا اس موقع پر موجود تھے اور علامہ کی کیفیت کا حوالہ یوں دیتے ہیں:

ہنگامیکہ بر تربت بادشاہ زندہ دل مغل بابر رحمۃ اللہ علیہ فاتحہ میخواند اشک میریخت و رواں بادشاہ مغل را برا یکہ پیکرش در آغوش قلل سنگینی کابل آرامیدہ مسعود و خوش نصیب می دانست۔[۴۳]

۴۲۔ مثنوی مسافر، ۶۴ – ۶۵۔

۴۳۔ مقالاتِ یوم اقبال، ۳۰۔

(جس موقع پر وہ زندہ دل مغل بادشاہ بابر رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرے پر فاتحہ پڑھ رہے تھے، ان کی آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری تھے۔ وہ مغل بادشاہ کی روح کو، باوجود یہ کہ ان کا جسم کابل میں یہاں کے پہاڑوں کی بھاری چوٹیوں کی آغوش میں آرام فرما رہا تھا، خوش نصیب اور مسعود سمجھتا تھا۔)

علامہ کی اس کیفیت کی گواہی افغان صحافی مقبول احمد یوں دیتے ہیں: "علامہ اور ان کی پارٹی کے دوسرے زعما جب باغ تشریف لے جا رہے تھے فیض محمد خان وزیر خارجہ، شاہی خاندان کے بعض ارکان، شعرا، ادبا، اور چند صحافی بھی ان کی معیت میں تھے۔ مجھے یاد ہے کہ علامہ اقبال شہنشاہ ظہیر الدین بابر کی قبر پر فاتحہ پڑھتے پڑھتے زار و قطار رو رہے تھے۔ ان کے اشکوں سے ان کا رومال بالکل تر ہو گیا تھا۔" (۴۴)

آج کابل میں اقبال کی آخری رات تھی۔ آپ کی دیگر مصروفیات کے علاوہ ایک نئی بات یہ سامنے آتی ہے کہ آپ نے کابل میں قیام کے دوران نام ور روحانی پیشوا اور جنگِ آزادی کے رہ نما مولانا فضل واحد المعروف بہ حاجی صاحب ترنگزئی سے بھی ملاقات کی تھی۔ اکرام اللہ شاہد، عزیز جاوید کی کتاب **برصغیر میں تحریکِ آزادی کا ایک عظیم مجاہد حاجی صاحب ترنگزئی** میں درج ترنگزئی حاجی صاحب کے بیٹے بادشاہ گل پیر افضل اکبر شاہ کی زبانی لکھتے ہیں: "اقبال جب افغانستان میں آئے تو اس وقت ہم بھی باباجی کے ساتھ کابل میں مقیم تھے۔ علامہ اقبال نے بابا جی صاحب کے ساتھ تنہائی میں ملاقاتیں کیں۔ وہ باباجی کا نہایت احترام کرتے تھے اور جب وہ باباجی صاحب سے ملنے آئے تھے باباجی کے پاس بیٹھنے سے پہلے جوتے اُتار کر نہایت مؤدب ہو کر باباجی کے پاس بیٹھے تھے۔ جب دونوں محو گفت گو ہوتے تو وہاں سے باقی تمام لوگوں کو اور ہمیں باہر نکال دیا جاتا۔"(۴۵) کابل میں حاجی صاحب ترنگزئی سے حضرت علامہ کی اس ملاقات کا حوالہ اس کے علاوہ کہیں اور نہیں ملا اور نہ اس سے پہلے اس ملاقات کا ذکر کہیں کیا گیا ہے۔

سوموار ۳۰/ اکتوبر ۱۹۳۳ء

علامہ اور ان کے ساتھی صبح آٹھ بجے کابل سے غزنی روانہ ہوئے۔ حکومت افغانستان نے مہمانوں کے باسہولت سفر کا پورا اہتمام کیا تھا۔ متوقع قیام گاہوں میں پہلے سے پیغام بھجوا دیے گئے تھے اور بطورِ میزبان سرور خان گویا ساتھ تھے۔ سواری اور باربرداری کے لیے دو موٹریں اور دو لاریاں دی گئیں تھیں۔ ایک موٹر میں علامہ اقبال،

۴۴۔ اکرام اللہ شاہد، **اقبال و افغانستان**، ۶۶۔

۴۵۔ نفس مرجع، ۵۲۔

سید سلیمان ندویؒ اور بیرسٹر غلام رسول تھے اور دوسری میں پروفیسر ہادی حسن، سرور خان گویاؔ اور عبدالمجید (نمائندہ سفارت خانہ افغانستان دہلی) تھے۔ ایک لاری کھانے کے سامان اور کھانا پکانے اور کھلانے والے ملازمین کے لیے تھی۔ دوسری لاری پر مہمانوں کا سامان لدا تھا۔ اس قافلے میں اعزازی حفاظت کی غرض سے دس بارہ سپاہیوں کا دستہ بھی شامل تھا۔[۴۶] کابل سے غزنی ۸۲ میل ہے۔ تقریباً ایک بجے غزنی پہنچے۔ یہاں مہمان سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرائے گئے۔ بازار کی مختصر سیر کے بعد مہمانوں نے کھانا کھایا۔[۴۷]

غزنی کے آثارِ قدیمہ کی سیر کے لیے آفیسر مہمان دار سرور خان گویا نے ایک پیر فرتوت "ملا قربان" کو بلایا۔ یہ صاحب نوے سال کی عمر میں تھے اور غزنیں کے گوشے گوشے سے آگاہ تھے۔ موجودہ شہر سے کئی میل ہٹ کر قدیم شہر کے نشانات ہیں جو سلاطین غزنیں کا پایۂ تخت تھا۔ اس مقام کے مخالف سمت شہر کی دوسری طرف پرانا قبرستان ہے جہاں بیسوں عہد ساز ہستیاں محوِ خواب ہیں۔[۴۸]

ان ہستیوں میں اگر ایک طرف جہانِ معنوی کے سلطان حکیم سنائی غزنوی کا ذکر آتا ہے تو دوسری طرف فاتح سومنات محمود غزنوی کا نام نامی آتا ہے، سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

> حکیم و شاعر اقبال کو حکیم شاعر سنائی کے مزار دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا۔ خانہ سے نکل کر پیادہ ہم حکیم موصوف کے مزار کی طرف چلے۔۔۔۔ حکیم سنائی کی جلالتِ شان سے کون مہمان واقف نہیں ہم سب اسی منظر سے متاثر تھے۔ مگر ہم میں سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا۔ وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے۔[۴۹]

جناب سرور خان گویاؔ اس لمحے کی یادداشت کو یوں محفوظ کرتے ہیں: "تربت حکیم سنائی را چندان از اشک گلگون نمود کہ سنگ را بروی رقت آمد۔"[۵۰] (حکیم سنائی کی قبر پر اس نے اتنے آنسوؤں کا پانی چھڑکا کہ وہاں کے پتھر بھی موم ہو گئے۔) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ کی حکیم سنائی کی مزار پر حاضری کو ایک اور نگاہ سے

۴۶۔ **اقبال ریویو**، جنوری ۱۹۷۶ء، ۴۸۔

۴۷۔ ندوی، **سیر افغانستان**، ۲۷ – ۲۸۔

۴۸۔ **اقبال ریویو**، جنوری ۱۹۷۶ء، ۴۸۔

۴۹۔ ندوی، مصدرِ سابق، ۶۸۔

۵۰۔ **مقالاتِ یوم اقبال**، ۳۰۔

دیکھا ہے، وہ کہتے ہیں: "وہ حکیم سنائی کے مزار پر بھی گئے۔ اقبال، سنائی کو رومی کے بعد شعر و حکمت میں اپنا دوسرا استاد مانتے تھے۔ اس نادر اور زریں موقع نے ان کی طبیعت کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ وہاں انھوں نے جو شعر کہے ہیں وہ ندرت اور معنویت کے ساتھ ان کے ذوق و شوق، حسرتوں اور امیدوں کی سچی تصویر ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے اپنے عہد پر ایک فلسفی شاعر اور انقلابی مسلمان کی طرح نظر ڈالی ہے اور اپنی زیارت کو تاریخی حیثیت دے دی ہے۔"(۵۱)

اقبال نے **بالِ جبریل** میں ایک یادداشت ان الفاظ میں درج کی ہے اور حکیم سنائی غزنوی کی زیارت کا تذکرہ کیا ہے: "شہید امیر المؤمنین نادر شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ کے لطف و کرم سے نومبر ۱۹۳۳ء میں مصنف کو حکیم سنائی غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ چند افکار پریشاں، جن میں حکیم ہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی کی گئی ہے، اس روزِ سعید کی یادگار میں سپرد قلم کیے گئے: ما از پے سنائی و عطار آمدیم۔" (۵۲)

خاکِ اولیاے غزنی میں اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ایک لمحے کی تاریخ کو اہلِ قلم نے محفوظ کیا ہے؛ مرزا ادیب حکیم سنائی کی زیارت کے بعد کا حال لکھتے ہیں:

> حکیم سنائی کے مزار سے نکل کر علامہ سلطان محمود کے مرقد پر جاتے ہیں۔ گویا ایک صاحب دل سے رخصت ہو کر ایک صاحبِ شمشیر کے ہاں پہنچے ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں علامہ نے سلطان محمود کو بھی اپنی ہیرو گردانا ہے۔ شاید اس موقع پر سوال کیا جائے کہ سلطان تو محض ایک حکمران تھا جس نے اپنی تیغ جوہر دار سے دشت و در کو لرزا دیا تھا اور جس کے ہندوستان پر سترہ حملے ایک تاریخی حقیقت کو محیط ہیں۔ علامہ کی نظر میں کیا ایک فاتح ہی ہیرو بننے کی صلاحیت رکھتا ہے یا یہ مقام و شرف حاصل کرنے کے لیے فاتح کے علاوہ اسے کچھ اور بھی بننا چاہیے؟ علامہ فقط اس شخصیت کو اپنا ہیرو مانتے ہیں جو صاحبِ شمشیر ہو تو ساتھ ہی صاحبِ دل بھی ہو۔ سلطان محمود فاتح ہوں، اورنگزیب عالمگیر ہوں، نادر شاہ ہوں یا سلطان محمود غزنوی یہ شہسوار تو تھے ہی، مگر شہسواری کے ساتھ ساتھ صاحبِ خلق عظیم اور صاحبِ صدق و یقین بھی تھے، ان کی بادشاہی میں فقر تھا۔(۵۳)

محمود غزنوی کی زیارت میں علامہ کی کیفیات کا حال جاننے کے لیے ہم پھر ان کے افغان دوست

۵۱۔ ابوالحسن علی ندوی، **نقوشِ اقبال**، ۲۶۰۔

۵۲۔ محمد اقبال، **بالِ جبریل** (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۱ء)، ۲۲۔

۵۳۔ مطالعہ اقبال کے چند پہلو، ۵۶ – ۵۸۔

سرور خان گویا سے رجوع کرتے ہیں: "در پیش گاہ روضہ شہنشاہ بزرگ ما سلطان محمود غزنوی، سر احترام فرود آورد۔"(۵۴)

(ہمارے عظیم شہنشاہ محمود غزنوی کے روضے کی ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا سر فرطِ احترام سے جھکا لیا۔) سلطان محمود غزنوی کے مزار کی حاضری کے بعد علامہ کی اگلے روحانی منزل کا حال سید سلیمان ندوی صاحب لکھتے ہیں:

ان شاہی مزارات سے لوٹے تو ڈاکٹر اقبال صاحب کو لاہور کی مناسبت سے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، جن کا مزار لاہور میں ہے، کے والد ماجد کے مزار کی تلاش ہوئی۔ ملا قربان نے کہا میں وہ مزار جانتا ہوں، چناں چہ ان کی ہدایت کے مطابق موٹر نے پرانے غزنین کے ویران سنسان میدان کو طے کرنا شروع کیا اور آخر ایک مقام پر لے جا کر توقف کیا۔ آگے موٹر کا راستہ نہ تھا چناں چہ ملا صاحب مع ڈاکٹر صاحب وغیرہ اتر کر پیادہ گئے اور زیارت کر کے واپس آئے۔ میں درد سینہ کی شکایت کے سبب نہ جا سکا۔(۵۵)

روحانیت و معنویت کے مزار کے احاطے میں علامہ کی کیفیت کا حال کیا تھا، سرور خان گویا لکھتے ہیں: "وقتے کہ مابدین اماکن مقدس و پراز جلال و حشمت می رسیدیم، ما دعامی نمودیم ولی شاعر اسلام رامی دیدیم کہ مثل تصویر بی جان استادہ و سیلاب اشک از چشمانش جاریست حتی از دیدن او حال ما دگر گوں میشد"۔(۵۶) (جب ہم ان مقدس اور پر جلال مقامات پر پہنچے ہیں تو ہم تو دعا میں مشغول تھے، لیکن شاعر اسلام کو ہم نے وہاں دیکھا کہ وہ ایک بے جان تصویر کی طرح کھڑا ہے اور آنسوؤں کا دریا اس کی آنکھوں سے اُمڈ رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ہم میں بھی یارائے ضبط نہ رہا۔)

حکیم سنائی کی شخصیت میں تبدیلی پیدا کرنے، غزنوی دربار سے خانقاہ لانے اور معنویت کی طرف میلان کا باعث بننے والا فقیر لائے خوار کے مزار پر بھی علامہ نے حاضری دی، **سیر افغانستان** میں ہے:

حکیم سنائی کی توبہ کی حکایت کے سلسلہ میں ایک مجذوب فقیر لائے خوار کا ذکر آتا ہے جس نے کہا تھا: بکوری سنائی می خورم کہ سنائی سے بڑکر بے وقوف کون ہوگا جو اپنے ہی جیسے انسانوں کی مدح و ستائش میں خرافات نظم کرتا ہے اور ان کو جا کر سناتا ہے۔ حکیم پر اس مجذوب کے اس فقرہ کا اثر ہوا اور توبہ کی۔ ملا قربان موجودہ غزنین کے بازار سے گزرتے ہوئے

۵۴۔ **مقالاتِ یوم اقبال**، ۳۰۔

۵۵۔ ندوی، **سیر افغانستان**، ۳۰۔

۵۶۔ **مقالاتِ یوم اقبال**، ۳۰۔

ایک گلی سے ایک مسجد کے اندر لے گئے اور بتایا کہ یہ اس لائے خوار کا مزار ہے۔[۵۷]

منگل ۳۱/ اکتوبر ۱۹۳۳ء

شب غزنین میں گزارنے کے بعد صبح آٹھ بجے روانہ ہوئے، گیارہ بجے دوپہر مقر پہنچے۔ راستہ بہت صاف اور ہموار تھا۔ مقر میں سرکاری آفیسروں کو مہمانوں کے آنے کی اطلاع تھی، جیسے ہی موٹریں آکر رکیں گارڈ آف آنرز نے سلامی دی، ایک دومنزلہ عمارت میں قیام وطعام تھا۔[۵۸] سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

مقر یعنی پرانا بیہق ایک پرانے تاریخی شہر کا نام ہے۔ جہاں سے بڑے بڑے ائمہ حدیث، مؤرخین اور اہل ادب پیدا ہوئے ہیں۔۔۔ اس کا فارسی تلفظ بہیہ ہے، مگر عربوں نے اپنے قاعدہ سے اس کو بیہق بنادیا اور وہی مشہور ہو گیا۔ ابو بکر احمد بن حسین مشہور بہ امام بیہقی شافعی جن کی سنن بیہقی اور دلائل النبوۃ مشہور کتابیں ہیں، یہیں کے تھے۔۔۔ نوجوان افغانوں کا دعویٰ ہے کہ پرانا بیہق یہی ہے؛ چناں چہ ہمارے فاضل افغان رفیق سفر سرور خان گویا نے بڑے وثوق کے ساتھ مجھے اس کا یقین دلایا۔ مقر کے قریب دو قبروں کے روضے دکھائی دیے۔ فاضل مذکور نے بتایا کہ ان میں سے ایک ابو الفضل بیہقی کی قبر ہے اور دوسری ابو النصر مشکانی کی۔ ابو الفضل بیہقی غزنوی خاندان کا مشہور مؤرخ ہے۔ ۴۷۰ھ میں وفات پائی ہے۔ ابو النصر مشکانی بھی اسی عہد کا ادیب و مؤرخ ہے جس کی تصنیف مقامات پچھلے مصنفین کا مأخذ ہے۔[۵۹]

دوپہر کا کھانا مقر میں کھا کر مقر سے ایک بجے چل کر چار بجے شام قلات غلزی پہنچے۔ کابل سے دو ہزار فٹ اور غزنین سے ایک ہزار فٹ کی بلندی کی وجہ سے قلات میں ٹھنڈک تھی۔ رات قلات میں بسر کی جہاں رات کو رفقائے سفر پروفیسر ہادی اور سرور خان گویا میں ایرانی اور افغان فارسی کے باہمی فضیلت پر ایک دل چسپ گفت گو ہوئی۔

بدھ یکم نومبر ۱۹۳۳ء

قلات غلزی سے آٹھ بجے صبح روانگی ممکن ہوئی۔ قلات سے قندھار تک پرانی منزلیں حسبِ ذیل تھیں:

۱۔ قلعۂ قلات سے تیر انداز تک 'جوترنک' نام ایک ندی کے کنارے آباد ہے اور جہاں درانی قوم کا مسکن شروع ہو جاتا ہے۔

۲۔ قلعہ تیر انداز سے شہر صفا تک اس شہر کو تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی کے مدار المہام قاضی فیض اللہ خان

۵۷۔ ندوی، مصدرِ سابق، ۳۰۔

۵۸۔ اقبال ریویو، جنوری ۱۹۷۶ء، ۴۹۔

۵۹۔ ندوی، مصدرِ سابق، ۳۱۔

نے آباد کیا تھا۔

۳۔ شہر صفا سے کاریز ملہدو تک یہ ایک چشمہ ہے۔

۴۔ کاریز ملہدو سے شہر قندہار تک۔

راستے کی خرابی کے باوجود قلات سے آٹھ بجے چل کر بارہ بجے چار گھنٹوں میں قندہار پہنچ گئے۔[۶۰]

قندہار سے متعلق علامہ کے درج ذیل ابیات امر ہو گئے ہیں:

قندار آں کشورِ مینو سواد اہلِ دل راخاکِ او خاکِ مراد

رنگ ہا بو ہا ہوا ہا آب ہا آب ہا تابندہ چوں سیماب ہا

لالہ ہا درخلوتِ کہسار ہا نارہا یخ بستہ اندر نار ہا

کوئے آں شہر است مارا کوئے دوست! ساربان بربند محمل سوئے دوست

می سرا یم دیگر از یارانِ نجد از نوائے ناقہ را آرام بو جد![۶۱]

(قندہار جنت نظیر علامہ ہے۔ اہل دل کے لیے اس کی مٹی خاکِ مراد کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں رنگ خوش بو اور پانی ہیں اور اس کے پانی پارے کی مانند چمک دار ہیں۔ اس کے پہاڑوں کی تنہائیوں میں لالے کے پھول کھلے ہیں، اس کے انار، اس کی آگ میں یخ بستہ ہیں۔ اس شہر کا کوچہ ہمارے لیے دوست کا کوچہ ہے۔ اے ساربان! دوست کی طرف چلنے کے لیے کجاوہ باندھ۔ میں پھر سے یارانِ نجد کے نغمے گاتا ہوں اور ان سے اونٹنی کو وہ نجد میں لاتا ہوں۔)

قندہار میں شاہی مہمان خانے میں ٹھہرنے کا پروگرام تھا، جہاں مہمانوں کی آمد پر شہر کے ممتاز افراد ملاقات کے لیے آئے، جن میں وزارتِ خارجہ افغانستان کا نمائندہ متعینہ قندہار اور یہاں کی ادبی انجمن کے ناظم عبدالحی حبیبی بھی شامل تھے۔ (عبدالحی حبیبی سے ملاقات کا احوال ان کی سوانح میں ملاحظہ ہو) ابھی علامہ عبدالحی خان

۶۰۔ نفس مصدر، ۳۲۔

۶۱۔ اقبال، مسافر، ۷۵۔

ے باتیں کر رہے تھے کہ قندہار کے گورنر تشریف لائے، ان سے بھی کچھ دیر باہم دل چسپی کی گفت گو رہی۔

مہمان خانے کے قریب ہی خرقہ شریف کی زیارت اور احمد شاہ درانی کا مقبرہ تھا۔ ان مقامات کی زیارت ے لیے علامہ اور دوسرے افراد پیدل روانہ ہوئے، البتہ واپسی کے لیے موٹروں کو مقبرے کے دروازے پر پہنچ نے کا حکم دیا گیا، پہلے خرقہ شریف کی زیارت کی۔ مشہور ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کا ملبوسِ اقدس ہے۔[۶۲]

زیارتِ خرقۂ مقدسہ کے دوران علامہ کی معنوی کیفیات و اسرار خود علامہ صاحب نے مثنوی مسافر میں ن کی ہیں۔[۶۳]

زیارتِ خرقہ مقدسہ کے دوران علامہ کی قلبی کیفیات کا جائزہ مرزا ادیب نے یوں پیش کیا ہے:

> زیارت خرقۂ مبارک ﷺ نے شاعر کے دل و دماغ پر ایک وجد کا سا عالم طاری کر دیا ہے اور اس کے ہونٹوں پر اس کے قلبی تاثرات ایک مترنم غزل کی صورت میں بکھر جاتے ہیں۔ اس غزل کی فضا میں جذب و مستی سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہاں شوق فراواں کا کیف ہوش افگن پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں سوز و ساز و درد و داغ کی ایک دنیا آباد لگتا ہے۔ عشق صادق حسن کی بارگاہ میں سجدہ ہائے شوق لٹا رہا ہے اور اس کی رگ رگ ایک پُر اسرار نشے سے سرشار ہو گئی ہے۔ شاعر کا جذبۂ بے اختیار غزل میں تڑپتا ہوا، مچلتا ہوا، رقص کناں جب خرقہ مبارک ﷺ کے قریب آتا ہے تو فی الفور سراپا عقیدت بن جاتا ہے۔[۶۴]

خرقہ شریف کی زیارت کے بعد معرکۂ پانی پت کے فاتح احمد شاہ بابا کے مزار پر حاضری دی۔ احمد شاہ بابا کے مزار پر حاضری کے بعد علامہ اور ان کے شرکائے سفر قندہار کے سب سے خوب صورت اور دل کش طبعی منظر رغنداب کے سفر کو روانہ ہوئے۔ ارغنداب کی سیر کرتے ہوئے بابا ولی قندہاری کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور واپسی پر چہل زینہ گئے۔ یہ ایک پہاڑی ہے جس کی چوٹی پر بابر نے اپنی ہندی فتوحات کا کتبہ لگایا ہے۔ پہاڑی کے دامن سے وپر تک پتھر کاٹ کر زینے بنائے گئے ہیں، جن کی تعداد چالیس مشہور ہیں؛ اس لیے اس پہاڑی کا نام چہل زینہ پڑ گیا ہے۔ علامہ پہاڑی پر نہ چڑھے، البتہ سید صاحب اور پروفیسر ہادی نے اپنے تاریخی ذوق کی تسکین کے لیے پہاڑی سر کی۔[۶۵]

۶۲۔ **اقبال ریویو**، جنوری ۱۹۷۶ء، ۵۰۔

۶۳۔ دیکھیے: مثنوی مسافر، ۷۷ – ۷۸۔

۶۴۔ **مطالعہ اقبال کے چند پہلو**، ۶۳۔

۶۵۔ **اقبال ریویو**، جنوری ۱۹۷۶ء، ۵۱۔

جمعرات ۲/نومبر ۱۹۳۳ء

صبح آٹھ بجے چائے اور ناشتہ سے فارغ ہو کر نو بجے قندہار سے روانہ ہوئے۔ گورنر قندہار نے مہمانوں کو کچھ خشک میوے اور قندہاری اناروں کے دو ٹوکرے تحفہ بھیجے اور قافلہ چل پڑا اور بارہ بجے قلعہ جدید پہنچ گیا جو افغانستان کی آخری چوکی تھی۔ یہاں گویا اور دوسرے شاہی ملازمین نے علامہ اور ان کے ساتھیوں کو الوداع کہا۔

چمن شہر کے دروازے پر مسلمانان شہر نے استقبال کیا اور ایک رستوران میں چائے کا اہتمام کیا۔ اہل شہر کی خواہش تھی کہ علامہ اور سید صاحب اپنا سفر ملتوی کر کے یہاں کے مسلمانوں کے سامنے تقاریر کریں مگر ہر دو حضرات نے معذرت کر دی۔ رستوران میں مختلف خیال کے مسلمان جمع ہو گئے تھے جو سیاسیات کی مختلف راہوں سے آشنا تھے۔ علامہ اور سید صاحب سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہتے۔ علامہ کے سکول کے زمانے کے ہندو دوست جو چمن میں مطب کرتے تھے، ملنے آئے۔[۶۶] چمن میں علامہ کی آمد کے موقع پر جن لوگوں نے علامہ سے ملاقاتیں کی تھیں، ان میں چودھری نور الٰہی قریشی، ملا احمد جان قریشی اور حاجی خوشی محمد وغیرہ شامل تھے۔ حاجی خوشی محمد کے نام سے چمن میں ایک روڈ بھی منسوب ہے۔ نسلاً زدران پٹھان تھے، مگر ثقافتی اعتبار سے ٹھیٹ پنجابی تھے، ان کے گھر سے علامہ کے لیے حقہ بھی لے جایا گیا تھا۔[۶۷] علامہ ۲/نومبر کو بعد از ظہر چمن سے روانہ ہو کر شام کوئٹہ پہنچے۔ اور یہ خبر انقلاب میں شائع ہوئی۔[۶۸] کوئٹہ میں آپ کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ استقبال کے لیے اسٹیشن پر مہر، سالک، شیخ نیاز علی ایڈووکیٹ چودھری محمد حسین اور دیگر رفقا موجود تھے۔[۶۹] سفر سے واپسی پر شرکائے سفر کے تاثرات اخبارات میں شائع ہوئے؛ چناں چہ علامہ نے ۶/نومبر ۱۹۳۳ء کو اپنے ہم سفروں کی ایما پر اپنے دورۂ افغانستان کے بارے میں درج ذیل اخباری بیان جاری کیا:

سب سے پہلے جو قابلِ ذکر چیز ہمیں نظر آئی ہے وہ یہ ہے کہ افغانستان میں لوگوں کے جان و مال بالکل محفوظ ہیں۔ یہ ایک اچھی حکومت کے لیے بذاتِ خود ایک بہت بڑی کامیابی ہے، جسے صرف چار سال پیشتر ملک میں عام بغاوت کو فرو کرنا پڑا ہو۔ دوسری بات جس سے ہم متاثر ہوئے وہ وہاں کے وزرا کی نیک نیتی اور اخلاص ہے جس سے وہ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ سخت قسم کے قدامت پسند لوگ بھی ان وزرا کے حامی ہیں اور نتیجتاً جیسا کہ ہمارے سامنے ایک مقتدر افغان

۶۶- نفسِ مرجع، ۵۱۔

۶۷- خوشی محمد مرحوم کے صاحب زادے حاجی اللہ دتہ باوا سے انٹرویو، ۶/اگست ۱۹۹۶ء بمقام چمن۔

۶۸- انقلاب، ۵/نومبر ۱۹۳۳ء۔

۶۹- انقلاب، ۷/نومبر ۱۹۳۳ء۔

عالم نے کہا کہ آج کے افغانستان میں ملاؤں اور نوجوانوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ حکومت افغانستان کا ارادہ ہے کہ سارے محکمۂ تعلیم کو جدید طریقوں پر از سرِ نو ترتیب دیا جائے اور ساتھ ساتھ افغانستان اور ہمسایہ ممالک کے درمیان والی سڑکوں کی مرمت کی جائے۔ نئی یونی ورسٹی بتدریج ترقی کر رہی ہے اور اس کے لیے پہلے ہی ایک خوب صورت اور وسیع محل مخصوص کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے شعبۂ طب قائم کیا گیا ہے اور اس میں اعلیٰ تعلیم شروع ہو گئی ہے۔ دوسرا شعبہ جس کا قیام زیرِ غور ہے وہ سول انجینئرنگ کا ہو گا۔ رہا سڑکوں کا سوال تو کابل کو پشاور سے ملانے والی ایک نئی سڑک آئندہ دو سال کے عرصہ میں تعمیر ہو جائے گی اور یہ سڑک اس لیے بہت اہم ہے کہ یہ وسطی ایشیا کو وسطی یورپ سے قریب کر دیتی ہے۔ اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان نے ہمیں شرف بازیابی بخشا اور کافی طویل گفت گو ہوتی رہی۔ اعلیٰ حضرت کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ان کا ملک پھلے پھولے اور اپنے ہمسایہ ممالک سے صلح اور آشتی قائم رکھے۔ افغانستان آج ایک متحد ملک ہے جہاں ہر طرف بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں اور حکام کافی سوچ بچار کے بعد نئے پروگرام بنا رہے ہیں۔ افغانستان سے ہم اس یقین کے ساتھ واپس لوٹے ہیں کہ اگر موجودہ حکام کو دس سال تک اپنا کام جاری رکھنے کا موقع مل جائے تو بلاشک و شبہ افغانستان کا مستقبل شاندار ہو گا۔[۷۰]

ابھی علامہ سفر افغانستان سے لاہور لوٹے ہی تھے کہ کابل میں امیر نادر شاہ کی شہادت کا الم ناک سانحہ پیش آیا۔ علامہ سفر افغانستان کی خوشگوار یادوں اور نادر شاہ غازی کی الم ناک شہادت کے اضطراب سے پیش و تاب دکھائی دیتے ہیں۔ علامہ کے دو مکتوبات بنام راغب احسن اس اضطراب کے آئینہ دار ہیں۔ ۱۲/ نومبر ۱۹۳۳ء کو راغب احسن کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

میں گذشتہ اتوار کابل سے براہ غزنی و قندھار واپس آیا... امیر نادر شاہ کی شہادت کی خبر ایک ناقابل برداشت صدمہ میرے لیے ہے اور یقیناً ساری دنیائے اسلام کے لیے۔ یہ بڑا دین دار اور خدا پرست بادشاہ تھا۔ کابل میں اس کے متعلق ایسی حکایات مشہور ہیں کہ ان کو سن کر صدیقؓ اور فاروقؓ یاد آتے ہیں۔ جمعہ کی نماز میں نے ان کے ساتھ کابل کی جامع مسجد میں ادا کی۔ ان کے محل میں ایک روز عصر کی نماز ان کی امامت میں ادا کی۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

مجھے امید ہے کہ افغانستان دوبارہ کسی انقلاب میں مبتلا نہ ہو گا۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں، بادشاہ کی شہادت پرائیویٹ عداوت و رقابت کا نتیجہ ہے اور غالباً جنرل غلام نبی خاں کے قتل سے اس کا تعلق ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ لوگ امان اللہ خان کی واپسی چاہتے ہیں، غلط ہے۔ واللہ اعلم۔ دوران قیام افغانستان میں وہاں کے نوجوانوں میں اسلامی خیالات اور افکار کی اچھی تخم ریزی ہوئی۔ زیادہ گفت گو اس امر کے متعلق پھر کبھی ہو گی۔

۷۰۔ لطیف احمد شیروانی، **حرفِ اقبال**، (اسلام آباد: علامہ اقبال یونی ورسٹی، ۱۹۸۴ء)، ۲۰۳-۲۰۴۔

سفر سے واپس کے بعد علامہ اقبال کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کا انھوں نے بڑا خوش گوار تاثر قبول کیا تھا۔ اس سفر میں انھوں نے اپنی معروف مثنوی مسافر ترتیب دی جس میں انھوں نے اپنی حدیثِ دل کو کھول کر بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی اہل افغانستان کے لیے ایک پیام ہے۔ اس میں انھیں اپنی عظمتِ رفتہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، وحدت و مرکزیت کا سبق یاد دلایا گیا ہے۔ یہ سفر اقبال کے بہت اہم اسفار میں سے ہے۔